اسلام اور طبقاتی نظام

کیا اسلام نے انسانی سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیا ھے؟

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی صاحب قبلہ

بسمہ تعالیٰ ولہ الحمد

خودداری اور شرافتِ نفس انسان کا جوہرِ فطرت ہے۔ جس نظامِ اقتصادی کی رفتار اس تقاضائے طبعی سے الگ ہوگی، عقل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتی۔ اسلامی نظام نہ صرف عدالتِ اجتماعی کے خلاف ہے، بلکہ وہ انسان میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتا ہے۔ اسلام ہمیشہ نوعِ انسانی کو دو حصوں میں منقسم دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی حکومت میں دائمی طور پر ایک طرف بلند و بالا، پر ہیبت، باشوکت، عیش و راحت کے سامانوں سے ابلتے ہوئے قصر نظر آتے ہیں جن میں رہنے والوں کی صورتیں بارونق، مطمئن اور ہشاش بشاش ہیں۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف پست و حقیر، تنگ و تاریک، آبادی سے دور، ساز و سامان سے خالی جھونپڑوں کی ایک طویل لائن دکھائی دیتی ہے ان میں زندگی کے دن کاٹنے والوں کے چہروں پر پریشاں حالی کے لائے ہوئے آثار، اضمحلال، ان کی آنکھوں میں فقر و فاقہ کے ڈالے ہوئے حلقے، ان کے جسموں پر بے جوڑ، پرانے پھٹے ہوئے کپڑے ہیں۔ ان کے بچوں کی دھوپ میں تونسائی ہوئی رنگت اور بھولی بھالی کمھلائی ہوئی صورت دیکھکر کلیجا منھ کو آتا ہے۔

کیا اسلام کی عدالت اجتماعی یہی ہے کہ لوگ دولت مندوں کی نگاہِ کرم کا آسرا لگائے، ان کے سر سے اترے صدقے کے چند ٹکڑوں کے لیے ہمیشہ دونوں ہاتھ پھیلائے رہیں؟ کیا اس میں انسان کی کھلی ہوئی تذلیل اور آبروریزی نہیں ہے؟

یہ ان دماغوں کے خیالات ہیں جن پر اشتراکیت اور بے دینی پوری طرح تسلط پا چکی ہے۔ انھوں نے بیرونی خیالات سے متاثر ہوکر، اسلام سے بدعقیدگی اور بدگمانی کی بنا پر اس میں غور و خوض کرنے کی ذرہ بھر زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ ان کے نزدیک خمس و زکاۃ بھیک ہے جو مال دار احسان و تفضّل کے طور پر فقیروں کو دیتے ہیں۔

صدقے کا لفظ دھوکا نہ دے

انسان کی بالغ نظری کا تقاضا ہے کہ لفظی گرفتوں سے بالاتر ہوکر الفاظ کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآنِ مجید کی آیت: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً کو دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ لغت میں چونکہ صدقہ ہر اس عطیے کو کہتے ہیں جو بغرضِ ثواب دیا جائے، لہٰذا اس آیت میں زکاۃ کے لیے صدقے کا لفظ صرف کر دیا گیا ہے۔ احسان اور مہربانی کا پہلو اس صدقے میں ہوسکتا ہے جو اپنی مرضی سے نکالا جائے، اس میں حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتی ہے، لیکن زکوٰۃ کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا ادا کرنا قانونِ حکومت کی رو سے ضروری ہے۔ جو شخص اس کے دینے سے انکار کرے، اسے حکومتِ اسلامی کا مخالف سمجھا جائے گا۔

نظامِ اسلام میں خمس و زکوٰۃ کی حقیقی نوعیت سمجھنے کے لیے مندرجۂ ذیل حقیقتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

خمس و زکوٰۃ قانونی ٹیکس ہیں

دنیا کی تاریخِ اقتصادیات میں زکوٰۃ سب سے پہلا باضابطہ ٹیکس ہے جو حکومت نے عوام کے لیے واجب الادا قرار دیا ہے۔ اسلام سے پہلے ٹیکس کی مقدار معین نہیں تھی۔ حکام وقت اپنی ذاتی ضروریات کے لیے جتنا چاہتے، اپنے زیر دستوں سے وصول کر لیتے تھے۔ لطف یہ کہ اس کا بار دولت مند اور متوسط

طبقے کو چھوڑ کر فقیروں کے اوپر ہوتا تھا۔ اسلام نے پہلے پہل ٹیکس کی مقدار اور اس کی وصولی کو منظم کیا، اس کا بوجھ محض مال دار اور متوسط الحال طبقے کے کاندھوں پر ڈالا، فقرا کو بالکل سبک دوش کر دیا خمس و زکوٰۃ کی نوعیت ان صدقات سے مختلف ہے جس کا دارومدار اغنیا کی مرضی پر ہے، وہ حکومت کا عائد کردہ واجب الادا ٹیکس ہے۔ ان اموال کا مستحقین تک پہنچانا حکومت کی طرف سے ایک خدمت ہے جس پر صاحبانِ مال کو مامور کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ضرورت مند اشخاص کو ذلت و حقارت کا احساس کس بنا پر ہوگا؟

اسلام نے فقیروں کو شریکِ مال قرار دیا ہے

فقۂ جعفری میں فریضۂ زکوٰۃ مال داروں کے ذمے نہیں عائد کیا گیا ہے۔ اس کی نوعیت قرض سے بالکل جداگانہ ہے۔ وجوبِ زکوٰۃ کا تعلق خود ان اشیا سے ہوتا ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ اس امر کے ثبوت کے لیے جلیل القدر، بلند پایہ علماء کی مندرجۂ ذیل عبارتیں کافی ہیں۔

(۱) **انما مال علی الحول و الزکوٰۃ تجب فی عین المال دلیلنا اجماع الفرقہ۔** (خلاف، شیخ طوسیؒ)

(۲) **الزکوٰۃ تجب فی العین لا فی الذمۃ ذھب الیہ علمائنا۔** (منتہی، علامہ حلیؒ)

(۳) **لاریب فی تعلقھا بالعین فی الغلات الوارد فیھا العشر و نصفہ و نحوھا ماھو حقہ متشاعۃ فی العین الخارجیۃ بل و فی غیرھا کالنقدین و الانعام۔**

(جواہر الکلام، علامہ محمد محسنؒ)

(۴) **ان الزکوۃ تجب فی العین لا فی الذمۃ علی المشھور کما عن المفاتیح و غیرہ بل لم ینقل الخلاف فیہ عن احدین اصحابنا بل عن غیر واحد دعوی اجماعھم۔** (مصباح الفقاہیہ، علامہ آغا رضا)

(۵) **الاقوی ان الزکوٰۃ متعلقۃ بالعین کما ھو المشھور۔** (مستمسک العروۃ الوثقیٰ)

خمس و زکوٰۃ کے نفسِ اموال سے تعلق کا نتیجہ صاف ہے کہ مقررہ شرائطِ وجوب کے موجود ہونے کے بعد فقرا اموالِ اغنیا میں بمقدارِ فریضہ ان کے شریک ہو جائیں گے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا صریحی ارشاد ہے:

ان اللہ تبارک و تعالیٰ شرک بین الاغنیاء و الفقراء فی الاموال۔

خداوند عالم نے تمام اموال میں فقرا کو مال داروں کا شریک قرار دے دیا ہے۔

وجوبِ زکاۃ کے شرائط موجود ہونے سے پہلے اغنیا اپنے اموال کے بلا شرکت غیر تنہا مالک تھے، لیکن تعلق زکاۃ کے بعد فقیر ان کے حصے دار بنا دیے گئے ہیں۔ کیا اس حقیقت کے فقرا پر منکشف ہونے کے بعد بھی انہیں دولت مندوں سے خمس و زکاۃ لینے میں شرم آئے گی؟ کیا ایک حصے دار کو اپنے شریک مال سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے احساسِ کمتری دامن گیر ہوتا ہے؟

بے شک ضرورت ہے کہ یہ قانونی نکات غریب و امیر، دونوں طبقوں کے اچھی طرح ذہن نشین کر دیے جائیں۔ ان کے شعور و احساس کی گہرائیوں میں ان حقائق کو بخوبی پیوست ہو جانا چاہیے۔ قرآنِ مجید اور راہنمایانِ اسلام نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے قوم کی ذہنیت بدلنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ہدایت کی گئی کہ:

آمنو اباللہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ۔

خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس مال سے راہِ خدا میں کچھ خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا قائم مقام قرار دیا ہے۔ (سورۂ حدید)

قرآنِ مجید مال داروں کے ذہن میں یہ بات راسخ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری دولتوں کا اصل مالک خدا ہے۔ اس نے ان کو عارضی طور سے تمہارے پاس رکھ دیا ہے۔ تم راہِ خدا میں کچھ دے کر یہ خیال نہ کرو کہ اسے تم نے کچھ اپنی جیب سے دے

دیا۔تمھیں یہ سمجھنا چاہیے کہ تم نے ایک امانت اس کے حق دار تک پہنچادی۔ان تصورات کے ساتھ اگر خمس وزکاۃ دیا جائے تو نہ مال داروں کے لیے احساسِ برتری پیدا ہونے کا موقع ہوگا اور نہ فقیروں کو احساسِ کمتری پیدا ہونے کا موقع ہوگا۔

ضرورت مندوں کی کفالت حکومت کررہی ہے

شیخ مفید علیہ الرحمہ کے نزدیک صرف زکاۃ اور علامہ حلبی کے نزدیک خمس وزکاۃ، دونوں کی تقسیم حکومت اسلامی کے ہاتھوں ہوگی، ادا کردینے کے بعد ان سے صاحبانِ مال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔خمس وزکاۃ کی وصولی کی طرح مستحقین تک پہنچانے کا ذمے دار حاکم شرع ہے۔

ظاہر ہے کہ کسبِ معاش سے عاجزی یا آمدنی کے مصارف کے لیے ناکافی ہونے کی شکل میں اگر حکومت کچھ لوگوں کی کفالت اپنے ذمے لے لے تو اس میں بے عزتی اور آبروریزی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔دنیا کی کسی زبان اور عالم کی کسی تہذیب وتمدن میں اس عمل کو احسان وتفضّل سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔بے شمار تلخ تجربوں اور مظالم کے خوں ریز دریا میں برسوں انسانیت کے ہاتھ پیر مارنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ عاجز و محتاج اشخاص کی کفالت حکومت کے ذمے ہونی چاہیے۔اس تصور کی عمر بہت کم ہے۔یقیناً اسلام کے لیے فخر و نازش کا موقع ہے کہ اس نے یہ اصول اس وقت دنیا کے سامنے پیش کیا جب یورپ جہالت وبربریت کے جھولے میں پینگ لے رہا تھا۔

یہ بڑی تنگ نظری اور فکری بے مائیگی کی بات ہے کہ جب کوئی نظام مغربی یا مشرقی یورپ کے راستے سے آئے تو اسے بے چوں وچرا ماں کے سر آنکھوں پر جگہ دی جائے،لیکن جس وقت اسی کو اسلام اپنی تعلیمات کا جز قرار دے تو اسے تنزل و انحطاط، قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے الفاظ سے سرفراز کیا جائے۔

رفاہِ عام کے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں

یہ حقیقت ہے کہ صدرِ اسلام کے تمدنی حالات میں خمس و زکاۃ کی امانتیں فقرا تک پہنچانے کی صرف دو شکلیں تھیں۔ایک یہ کہ خود ان اشیا کو انھیں دے دیا جائے جن میں فریضۂ خمس وزکاۃ عائد ہوا ہے، دوسرے یہ کہ ان چیزوں کی قیمت نقدان کے ہاتھ پر رکھ دی جائے۔حکامِ شرع کے تشریحات میں خمس و زکاۃ کی تقسیم کے لیے محض ان دو صورتوں کا ذکر اس لیے ملتا ہے کہ اس وقت کے ماحول میں اور کوئی تیسری صورت ممکن نہ تھی۔قانونی طور پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ فقرا و مساکین کے ہاتھ میں اموالِ خمس وزکاۃ دینے کے بجائے ان کی تعلیم وتربیت کے واسطے حکومت کی طرف سے مفت مدارس قائم کردیے جائیں ،علاج وتدارک کے لیے مجبور بیماروں کے لیے شفاخانے بنادیے جائیں،کارخانوں اور فیکٹریوں کی شکل میں ان کے واسطے مستقل وسائل معاش مہیا کردیے جائیں۔

یہ تصرفات اگر حکومت اسلامیہ کے اصلی وارث امام معصومؑ کے ہاتھوں میں ہوں تو ان میں فقرا و مساکین کی رضا مندی حاصل کرنا شاید ضروری نہ ہو، کیونکہ امام کو افرادِ امت کے نفوس و اموال پر کامل اختیار ہے۔ان کو ہر شخص کے مصالح کا خود اس سے زیادہ لحاظ ہے۔غیبت امامؑ میں یہ منصب جامع الشرائط مجتہدین کی طرف پلٹتا ہے۔وہ ان تصرفات کے لیے مالکانِ اموال کی رضامندی کے بعد قطعاً مجاز ہیں۔کھلی ہوئی بات ہے کہ جن خوددار اور شریف النفس لوگوں کو براہِ راست خمس وزکاۃ لینے میں احساسِ کمتری دامن گیر ہوتا ہے، انھیں ایسی باعزت اور باضابطہ تقسیم میں کیا عذر ہوسکتا ہے؟

رہ گیا مستحقین کا وہ گروہ جو کم سنی، بیماری یا کسی اور عذر کی بنا پر کام کرنے سے عاجز ہے تو اس کی گزر بسر کا انتظام خمس وزکاۃ سے خود حکومت کرے گی۔احساسِ کمتری کسی شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں ہوسکتا ہے،لیکن حکومت کی جانب سے کفالت میں، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، توہین وتحقیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔اس کے بعد بھی اگر کسی کو کم تری وپستی کا احساس ہو تو اس کا تدارک کیا ہے؟ اس طرح کے افراد کے لیے آخر نظامِ اشتراکی

نے وہ کون سا کفالت کا اسلوب اختیار کیا ہے جو احساسِ کم تری کو بالکل پیدا نہ ہونے دے؟ شاید وہاں اس طرح کے ناکارہ اور مجبورِ محض لوگوں کو گولی مار کر ختم کر دیا جاتا ہو!

احساسِ کم تری کا کوئی ایک سبب نہیں ہے

نظامِ فطرت میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ افرادِ انسانی کی افتادِ طبع کا اختلاف ناقابلِ ترمیم تکوینی حقیقت ہے۔ جو بات ایک شخص کے لیے احساسِ کم تری کا باعث ہے، اسی سے دوسرے کو اپنی پستی اور حقارت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جو طبائع تخلیقی طور پر خود دار اور زیادہ حساس واقع ہوئے ہیں، انھیں قدم قدم پر احساسِ کم تری سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ احساسِ کم تری کا کوئی ایک سبب نہیں ہے جس پر آپ قابو پالیں۔ تمام اسباب کو ناپید کر دینا آپ کے بس سے باہر ہے۔ پستی اور کم تری کا احساس صرف بیرونی مادی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا ہے تاکہ انھیں حکومت کے ہاتھ میں دے کے اور سب پر برابر سے تقسیم کر کے آپ احساسِ کمتری کا دروازہ بند کر دیں آخر قدرتی اور اکتسابی، معنوی امور میں جو تفاوت ہے، اسے کیونکر دور کیجئے گا؟ ہر طالب علم اپنے مطلوب کے سامنے کمتری محسوس کرتا ہے، لہٰذا دلوں سے شوقِ طلب کو کھینچ لیجیے۔ ہر شاگرد اپنے استاد کے مقابل پستی محسوس کرتا ہے، لہٰذا تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قفل لگا دیجیے۔ ہر کامیاب وکیل اور ڈاکٹر کے مقابلے میں اس کے دوسرے، ہم پیشہ اپنے کو سبک پاتے ہیں، لہٰذا وکالت اور ڈاکٹری کا ڈپلومہ دینا موقوف کر دیجیے۔ ہر آتش بیان، قادرالکلام، فاضل خطیب دوسرے متکلمین کے چراغ بجھا دیتا ہے لہٰذا خطابت و تقریر قانوناً ممنوع قرار دے دیجیے۔ ہر معجز نگار صاحب طرز انشاپرداز سے دوسرے مضمون نویس آنکھیں چراتے ہیں، لہٰذا ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیجیے۔ ہر طباع و ذہین شخص سے غبی اور کند ذہن شرمندہ ہوتے ہیں، لہٰذا دماغ کا آپریشن کر کے ذکاوت و ذہانت کو نکال دیجیے۔ ہر فلک سیر، خوش نگاہ، خوش فکر شاعر سے دوسرے شاعروں کی نگاہیں نیچی ہوتی ہیں لہٰذا شعر و شاعری پر پہرے بٹھا دیجیے۔ ہر طاقت ور اور قوی الجثہ شخص کے مقابل کمزور اور لاغر شخص کو احساسِ کمتری ہوتا ہے، لہٰذا اس کی طاقت کو کسی طرح سلب کر لیجیے۔

ذرا انصاف کیجیے! کیا ان غیر مادی صلاحیتوں کو انجکشنوں کے ذریعے تمام افرادِ انسانی کے دل و دماغ میں مساوی طور پر آپ پہنچا سکتے ہیں؟ جب تک لوگوں کے درمیان استعداد، قابلیت اور تکوینی صفات میں تفاوت ہے، احساس کمتری اور احساسِ برتری کسی سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ ہاں! دونوں سے نجات صرف ذہنی اصلاح کے توسط سے ہو سکتی ہے جس کا بند و بست اسلام نے اخلاقی تربیت کے ذریعے کیا ہے۔

یہ عظیم غلط فہمی ہے

ان لوگوں نے اسلام کو سمجھنے کی بالکل کوشش نہیں کی ہے جن کا خیال ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو ہمیشہ دو طبقوں میں منقسم دیکھنا چاہتا ہے: اغنیا اور فقرا قانونِ اسلامی میں کوئی ایسی دفعہ نہیں ملتی ہے جو جامعۂ مسلمین میں طبقۂ فقرا کی موجودگی لازمی قرار دے جن کی گزر بسر اموالِ خمس و زکاۃ کے ذریعے ہو۔ اس کے برعکس اسلام کے نظامِ اقتصادی کی تدوین ایسے حکیمانہ انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے نفاذ و اجرا کے بعد فقیر نظر آنا ممکن نہیں ہے۔

تاریخ اسلام فخر کے ساتھ عمر بن عبدالعزیز کے دورِ خلافت و حکومت کی طرف دعوتِ نظر دے رہی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب یحییٰ بن سعید نے افریقہ سے اموالِ زکاۃ وصول کر کے انھیں مستحقین پر تقسیم کرنا چاہا تو پورے عالمِ اسلام میں ایک بھی فقیر دستیاب نہیں ہو سکا؟ فقیر سرے سے ناپید ہونے کی وجہ سے یحییٰ بن سعید کو یہ اموال غلام آزاد کرانے میں صرف کرنا پڑے۔ اسلامی نظامِ تمدن میں کسی ایسے طبقے کا وجود ضروری نہیں ہے جس کا مستقل ذریعۂ معاش خمس و زکاۃ کے اموال ہوں۔ بے شک چونکہ فقر و احتیاج ہمہ گیر بیماری ہے جس کا حملہ دنیا کے ہر سماج پر کبھی نہ کبھی ہوتا ہے، لہٰذا ایک دانش مند، دستور ساز اور مدبر قانون گزار کی دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ وہ اس مہلک مرض کے مقابلے کے

لیے احتیاطی تدابیر میں فروگذاشت نہ کرے۔

دنیا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام زمان و مکان کے حدود سے بالاتر پیغام کا نام ہے۔ اس کے دروازے ابدی طور پر ہر بشر کے لیے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر فرد اور ہر جماعت کو اپنے دائرۂ ہدایت میں آنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اسلام کوئی ساکن اور جامد مذہب نہیں ہے۔ وہ ایک متحرک تبلیغی مشن ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے دائرۂ اثر میں آنے والے اپنی منظم اور مرتب زندگی کو بگاڑ کر ایک نئے دورِ حیات میں قدم رکھتے ہیں۔ اس تازہ داخلی خارج کی وجہ سے ان کے معاشی اور اقتصادی حالات کا دگرگوں ہو جانا ضروری ہے۔ اسلام مجبور ہے کہ خمس و زکاۃ کے قانون کو دائمی اور مستمر قرار دے۔ وہ اس کے توسل سے اپنے دائرۂ ہدایت میں داخل ہونے والوں کی اقتصادی حالت پر قابو پا کر انھیں تدریجاً اس مثالی معیار پر لانا چاہتا ہے جہاں عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں مسلمان نظر آتے ہیں۔

ہر شخص دوسرے کے ساتھ بھلائی کر سکتا ہے

انسان مدنی الطبع اور فطری طور سے اجتماع پسند ہونے کی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں تعاون اور امدادِ باہمی کا محتاج ہے۔ امدادِ باہمی معاشرے کے افراد کے درمیان الفت و یگانگی اور اخلاص و مروت کے متبادل جذبات کی طالب ہے۔ ان جذبات کی پرورش از خود نہیں ہو سکتی بلکہ وہ مخصوص اسباب و وسائل کی مرہونِ منت ہے۔ جذبات، اخوت، مروت کے پیدا کرنے میں ایثار و احسان کی مدخلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حسنِ سلوک دشمنوں کے دلوں کو موم کر لیتا ہے۔ انسان کے ضمیر کا دباؤ قلب کو مجبور کر کے محسن کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ احسان و ایثار کا تعلق اموال اور غیر اموال ہر شے سے ہو سکتا ہے۔ حسنِ سلوک کے دائرے میں بڑی وسعت ہے۔ اسی گنجائش نے اس کا تبادلہ ہر شخص کے لیے ممکن بنا دیا ہے۔ امیر و فقیر کی طبقاتی تفریق اس بارے میں بالکل اثر انداز نہیں ہے۔ احسان و ایثار کا دروازہ ہر حساس اور شریف انسان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ قانونِ حکومت کی تحریک اور دباؤ سے مالی یا غیر مالی حسن سلوک میں احسان کا کوئی نشان نہیں ہے۔

خمس و زکاۃ چونکہ حکومتِ اسلامی کا عائد کردہ آئینی ٹیکس ہے، اس لیے اس کی ادائیگی ہرگز فقرا کے دل میں اغنیا کے لیے جذباتِ محبت و اخلاص کی تربیت نہیں کرے گی۔ اسلام! انسان کے نفس کی گہرائیوں میں اٹھنے والی تمام نزاکتوں سے باخبر تھا، اسی لیے اسلام نے خمس و زکاۃ کے علاوہ مطلقاً انفاق فی سبیل اللہ کو مستحب اور مستحسن قرار دیا ہے، مستطیع اور مال دار اشخاص کو بڑے زور و شور سے اس کی طرف رغبت دلائی ہے۔ خود قرآن اور اس کے ترجمان پیغمبر اسلامؐ نے تبرعات اور خیر خیرات کی جانب اپنے ماننے والوں کو برابر متوجہ کیا ہے۔

اسلام چونکہ اس فضیلت سے امیر و غریب دونوں کو نوازنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے نیکی اور بھلائی کرنے کے حدود میں بہت وسعت پیدا کر دی، ہر اچھے کام اور اچھی بات کو صدقہ قرار دے کر اس کے لیے اجر و ثواب کا وعدہ کر لیا۔

گزشتہ تشریحات کی روشنی میں یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ اپنوں یا غیروں کے ساتھ احسان کرنے میں ان کی تذلیل نہیں ہے، اس کے برخلاف وہ تالیفِ قلب اور جذباتِ محبت و اخلاق کی زیادتی کا سبب ہے۔ ذلت و حقارت کا احساس یک طرفہ حسنِ سلوک کی صورت میں ہوتا ہے، دو طرفہ حسن سلوک میں نہیں۔ اسلام نے اس سلوک کو صرف اموال کے دائرے میں محدود نہ کر کے تہی دست افراد کے لیے تبادلۂ احسان کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر احسان احساس کمتری پیدا کرتا ہے تو محض اس وقت کہ جب کسی کو کوئی چیز یا روپیہ پیسہ صدقے کے نام سے دیا جائے۔ اسلام نے خیرات کے لیے کوئی خاص راستہ معین نہیں کیا ہے۔ صدقے کے نام سے ہٹ کر حسنِ سلوک کی اور بہت سی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ضرورت مند اشخاص کے تحفظ کی خاطر کیا یہ ممکن نہیں کہ احسان کو تحفے اور ہدیے کا لباس

پہنا دیا جائے۔

اس حقیقت کو ذہن میں اچھی طرح راسخ کرنے کی غرض سے پھر دہرایا جاتا ہے کہ اسلام نے اپنے ماننے والوں کی معاشی زندگی کو مال داروں کے رحم و کرم سے ہرگز وابستہ نہیں قرار دیا ہے۔ خمس و زکاۃ کو اس نے حکومت کا واجب الادا قانونی ٹیکس قرار دے کر ضرورت مند افراد کی گزر بسر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ اگر حکومت کسی طبقے کی کفالت کو براہِ راست یا بالواسطہ اپنے ذمے لے لے تو اس طبقے کو احساسِ کم تری کس لیے ہوگا؟

تاریخ اسلام اور سیرتِ رسولؐ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ نظامِ اسلامی نے حکومت کو کامل اختیار دیا ہے کہ وہ قادر اور توانا افراد کے لیے وسیلہ معاش کا انتظام کرے۔ ایک شخص نے پیغمبر اسلامؐ سے اپنے لیے ذریعۂ معاش پیدا کرنے میں مدد چاہی چونکہ وہ صحیح و سالم اور محنت و مشقت پر قادر تھا، اس لیے آنحضرتؐ نے اس کو ایک کلہاڑی اور ایک رسی عنایت فرمائی۔ ہدایت کی کہ ان دونوں چیزوں کی مدد سے جلانے کی لکڑی بازار میں لاکر فروخت کیا کرو۔ پھر فرمایا کہ چند روز کے بعد نتیجۂ عمل سے مجھے مطلع کرنا۔

خیال کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ایک ذاتی فعل تھا، اسے نظام اسلامی کا جز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ آج جب کہ بیسویں صدی میں دنیا بالکل بدل چکی ہے، دست کاری کی جگہ مشینوں نے لے لی ہے، بڑے بڑے عظیم کارخانے قائم ہوگئے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کررہے ہیں۔ اس کے باوجود ہٹے کٹے اور مضبوط و طاقت ور لاکھوں آدمی، بے روزگاری اور بے کاری کا شکار ہوکر حیران و سرگرداں گھوم رہے ہیں۔ اس ایک کلہاڑی اور رسی کی کیا اہمیت ہے؟ یہ شبہ نہایت کمزور اور بے بنیاد ہے۔ کیا اس جہالت اور بے سروسامانی کے دور میں یہ ممکن تھا کہ رسول اللہ صلعم کارخانے اور فیکٹریاں قائم کرتے؟ کیا ان وسائل کے پیدا ہونے سے تیرہ سو برس پہلے یہ معقول تھا کہ پیغمبرؐ ان کے لیے تفصیل سے اصول و قواعد مرتب اور مدون کرجاتے؟ بالفرض اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم غیب کی مدد سے ایسا کر بھی دیتے تو اس وقت کون تھا جو ان کے مفہوم کو سمجھ سکتا؟ ان حالات میں رسولؐ جتنا کرسکتے تھے، اس میں آپ نے فروگزاشت نہیں کی۔ آپ کے منصب کا تقاضا تھا کہ اس خاص مسئلے میں کہ بے کاروں اور بے روزگاروں کے بارے میں حاکمِ شرع کی ذمہ داری کیا ہے، آپ بنیادی طور پر قانونی ہدایت فرمادیں۔ اس اجمالی اور بنیادی قانون کی تطبیق، جو حالاتِ زمانہ کے موافق و مناسب ہو، ہر دور کے علماء اور مجتہدین کا کام ہے۔

متذکرہ واقعہ اتنا ضرور بتاتا ہے کہ قانونِ اسلام کی رو سے حاکم شرع اس کا مجاز ہے کہ وہ قادر و توانا مستحقین کی عارضی امداد روک کر ان کے واسطے ایسا مستقل وسیلہ معاش مہیا کردے جس سے وہ محنت کرکے اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔ اس واقعے میں رسولؐ نے اس شخص سے یہ بھی فرمایا کہ بعد میں آکر اپنے نتیجۂ عمل سے مجھے مطلع کرنا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صاحبانِ احتیاج کے لیے سامانِ معیشت مہیا کرنے کی جو ذمہ داری حاکمِ شرع پر قانوناً عائد ہوتی ہے، رسولؐ پوری طرح اس سے سبک دوش ہونا چاہتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں میں حاجت مند افراد کے دو طبقے ہوں گے ایک وہ گروہ جس کے ہاتھ پیروں میں جان ہے، وہ کام کرکے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔

دوسری وہ جماعت جو کسی وجہ سے محنت و مشقت پر قادر نہیں ہے۔ اسلام نے ان دونوں طبقوں کا اصل کفیل اپنی حکومت کو قرار دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دوسرا طبقہ کہ جو عاجز ہے، وہ اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے گا اور حکومتِ اسلامی برابر اس کے ضروریاتِ زندگی کا انتظام کرتی رہے گی۔ رہ گیا پہلا گروہ، اس کے متعلق اسلام حاکمِ شرع کو مکمل اختیار دیتا ہے کہ وہ انھیں مفت کھانے کے لیے نہ دے، بلکہ ان کے واسطے کوئی ایسا وسیلہ معاش مہیا کردے جو محنت و مشقت کے ساتھ ان کی گزر بسر کے لیے کافی ہو۔

